



# منزل تسلیم و رضا

مفتی منیب الرحمن

تسلیم و رضا کے معنی ہیں: ”اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا، اپنی نفسانی خواہشات و ترجیحات کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینا، اپنی انا کو اس کی رضا میں فنا کر دینا، اسی کو فنا فی اللہ بھی کہتے ہیں، انگریزی میں اسے Total Submission سے تعبیر کیا جاتا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اسی معنویت کو ان آیات مبارکہ میں بیان فرمایا ہے:

- (1) ”اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے، (بقرہ: 207)۔“
- (2) ”بے شک اللہ نے اہل ایمان سے اُن کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، پھر (اللہ کے دشمنوں کو) قتل کر دیتے ہیں یا (راہ حق میں) شہید ہو جاتے ہیں، اس پر اللہ کا تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو وفا کرنے والا کون ہے، سو تم اپنی اس بیع کی خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے کی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، (توبہ: 111)۔“

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے تسلیم و رضا کی یہ لازوال مثال قائم کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”سو جب (باپ بیٹا) دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل گرا دیا، (الصّٰفّٰت: 103)۔“ مراحل ابتلا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزیمت و استقامت کی شہادت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کلمات طیبات میں دی ہے: ”اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا، تو وہ (اس امتحان میں) پورا اترے، اللہ نے فرمایا: میں تمہیں انسانیت کا امام بنانے والا ہوں، (بقرہ: 124)۔“ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ”بے شک ابراہیم (اپنی ذات میں) اللہ کی اطاعت گزار اُمت تھے، ہر باطل سے اجتناب کرنے والے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، (اللہ نے) ان کو چن لیا اور ان کو سیدھے راستے کی ہدایت دی اور ہم نے ان کو دنیا میں بھلائی عطا کی، آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں میں سے ہوں گے، (انجیل: 122-120)۔“

پس تسلیم و رضا کا یہ شعار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے توسط سے رحمۃ اللعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک پہنچا۔ غزوہ حنین میں قبیلہ ہوازن کی شدید تیر اندازی کے سبب جب وقتی طور پر مجاہدین



کے قدم اکھڑ گئے تو رسول اللہ ﷺ تنہا میدان میں پوری استقامت کے ساتھ کھڑے رہے اور فرمایا: ”میں نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔“ رسول اللہ ﷺ سے اللہ کی راہ میں عزیمت و استقامت اور جاں نثاری کی یہ وراثت آپ کے اہل بیت اطہار کو منتقل ہوئی اور میدانِ کربلا میں امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے اہل بیت اطہار و اعوان و انصار رضی اللہ عنہم کے ذریعے یہ اپنی معراج کو پہنچی، علامہ اقبال نے کہا تھا:

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم      نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقرب بندے سراپا تسلیم و رضا ہوتے ہیں، وہ اللہ کی قضا و قدر پر شاکی نہیں ہوتے بلکہ راضی رہتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جامع مسجد کوفہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ عبدالرحمن بن ملجم خارجی نے زیر لب کہا: ”میں ایسی چکی چلاؤں گا کہ لوگوں کو ان سے نجات دلا دوں گا۔“ کچھ لوگوں نے اس کی اس بات کو سنا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”اس کے ارادے خطرناک ہیں، یہ آپ کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔“ اس پر حضرت علی نے کہا: ”ابھی تو اس نے مجھے قتل نہیں کیا، اور ایک روایت کے مطابق آپ نے کہا: ”میں اپنے قاتل کو کیسے قتل کر دوں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا تھا: ”گزشتہ امتوں میں بد بخت ترین شخص وہ تھا جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور اس اُمت کا بد بخت ترین شخص وہ ہوگا جو تمہاری پیشانی اور چہرے کو خون سے رنگین کرے گا۔“ ایک بار بیماری کے عالم میں آپ سے کہا گیا: بہتر ہوتا کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لے جاتے: تو آپ نے فرمایا: اس بیماری میں میرا انتقال نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے عہد فرمایا تھا کہ موت سے پہلے مجھے امیر مقرر کیا جائے گا، پھر (جب میری شہادت کا وقت آئے گا تو) قاتل میری پیشانی سے جڑے تک مجھے خون سے رنگین کرے گا۔

یہ تمام حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا اور شاید قاتل کا بھی علم تھا، لیکن انہوں نے اپنے قاتل کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ وہ شہادت کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ یہی صورت حال امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ کی بھی تھی کہ جب شہادت کی منزل انہیں آفتاب نصف النہار کی طرح اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آرہی تھی، تب بھی آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی اور اس منزل کو پانے کے لیے آپ تیار رہے۔ شبِ عاشور کو انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: ”جو آج کی شب اپنے خاندان والوں کے پاس جانا چاہتا ہے تو میں اسے اجازت دیتا ہوں، کیونکہ قوم صرف میرے خون کی پیاسی ہے، تم پر رات کی ظلمت چھا چکی ہے، تم میں سے ہر ایک میرے گھر کے ایک فرد کا ہاتھ پکڑ لے اور رات کی تاریکی میں اپنے خاندانوں کی طرف نکل جائے، اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے، قوم کو میرا خون چاہیے، جب وہ مجھے شہید کر دیں گے تو ان کی عداوت کی پیاس بجھ جائے گی اور کسی اور کی خواہش انہیں نہیں رہے گی۔“ آپ کے اہلبیت کے مردوں نے کہا: ”آپ کے بعد جینے میں کوئی مزا نہیں ہے، لوگ کہیں گے: ہم نے اپنے بزرگوار، اپنے سردار، اپنے چچا زاد اور بہترین چچا کو تنہا چھوڑ دیا، ہم نے ان کی مدافعت میں ایک تیر اور ایک نیزہ بھی نہ چلایا، دنیاوی زندگی کی خاطر ہم نے تلوار تک نہ چلائی۔ واللہ! ہم آپ پر اپنی جانوں، اپنے مالوں اور اپنے اہل و عیال کو قربان کر دیں گے اور آخری سانس تک آپ کی مدافعت میں لڑیں گے، آپ کے بعد جینا کیا جینا ہے۔“





الغرض وہ سب کوہ استقامت تھے، موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود آپ کا ساتھ نہ چھوڑا، یہی منزل تسلیم و رضا ہوتی ہے کہ انسان دنیوی نفع و نقصان سے ماورا ہو کر حیات ابدی اور رضائے الہی کو اپنی منزل بنا لیتا ہے، تو اُن کے لیے جان کی قربانی بھی آسان ہوتی ہے، علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی  
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی  
تو اسے پیاناہ امر و زوفا سے نہ ناپ  
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

صبح عاشور آپ نے اتمام حجت کرتے ہوئے حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا: کیا مجھ جیسی شخصیت کو قتل کرنا تمہیں گوارا ہے، میں تمہارے نبی کا شہزادہ ہوں اور آج میرے سوا اللہ کی زمین پر کسی نبی کا فرزند موجود نہیں ہے، علی میرے باپ ہیں، جعفر طیار میرے چچا ہیں، سید الشہداء حمزہ میرے والد کے چچا ہیں، میرے اور میرے بھائی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”یہ دونوں نو جوانانِ جنت کے سردار ہیں، میرا مقام جاننا ہو تو اصحاب رسول سے پوچھو“۔ لیکن ان کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی اور سعادت ان کے مقدر میں نہ تھی۔

شعار تسلیم و رضا کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کربلا میں اُس معراج تک پہنچایا کہ جس کی نظیر تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی۔ اللہ کی راہ میں ایثار و قربانی کا کوئی ایسا عنوان باقی نہ رہا جسے آپ نے اپنی نسبت سے مُشرّف نہ کیا ہو۔ اس سے پہلے جب آپ مدینہ منورہ سے عزم سفر کرنے لگے تو جلیل القدر صحابہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابوسعید خدری وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کو اس سفر سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اہل کوفہ کی جفا کا بھی حوالہ دیا، لیکن آپ اپنے عزم پر قائم رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل کوفہ نے بڑی تعداد میں خطوط بھیجے، آپ کو فدا آنے کی دعوت دی اور بطور امیر المومنین و خلیفہ آپ کی بیعت کا وعدہ کیا۔ آپ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے نسبتِ قرابت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرزند اور حضرت سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا لختِ جگر ہونے اور اپنے علم اور ورع و تقویٰ کے سبب آپ خلافت کے اہل ہیں۔ چنانچہ آپ عمرہ ادا کرنے کے بعد منازل سفر طے کرتے ہوئے کربلا پہنچے اور محرم الحرام 61ھ کے یوم عاشور کو جب کوفہ کی مساجد سے جمعۃ المبارک کی اذان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، شقی القلب لوگ تقریباً اُسی وقت نواسہ رسول کی گردن پر خنجر چلا رہے تھے۔ یہ منظر کسی بھی مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے لیکن امت کی بد نصیبی کہ بظاہر یہ ناممکن فعل واقع ہوا اور آج تک اس پر تمام اہل ایمان اور محبانِ رسول ﷺ و محبانِ اہل بیت رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین غمگسار ہیں۔

لیکن ستم یہ ہے کہ محبتِ حسین کے دعوے دار تو بہت ہیں اور اپنے اپنے انداز میں ان کی یاد بھی مناتے ہیں، ان کا غم بھی تازہ کرتے ہیں اور مجالس بھی منعقد کرتے ہیں، مگر اُن کی اقدار کو زندہ کرنے والے آج بھی کم ہیں، علامہ اقبال نے سچ کہا تھا:

گر چہ تابدار ہے، اب بھی گیسوئے دجلہ و فرات  
قافلہٗ حجاز میں، ایک حسین بھی نہیں